

نکھوں کے ہیرے رضیہ فصیح احمد

یہ کس کی او۔ سی کھڑی ہے۔ میں نے ریلوے یارڈ میں کھڑے شاہانہ کمپارٹمنٹ کو دیکھ کر اپنے اسسٹنٹ بلبر سے پوچھا۔
یہ ہندوستان کے بٹوارے سے بھی بہت پہلے کی کہانی ہے۔ میں راجھستان کے ایک چھوٹے سے شہر میں ریلوے کے محکمے میں تعینات تھا۔
صاحب، وہ اپنے سیٹھ صاحب نہیں ہیں، ڈیوڈ نے کے رئیس جو اپنے کرتے میں ہیرے کے بٹن لگاتے ہیں، ان کے تین بیٹے اس کار میں رہ رہے ہیں۔

مگر کیوں؟

ان کے نوکروں سے سنا ہے کہ سیٹھ نے انھیں میلے میں پارس ناتھ جی کی زیارت کے لئے بھیجا ہے مگر یہ تین دن سے اٹرکنڈ سٹیوون میں پڑے ہیں، واپس جا کر باپ سے کہہ دیں گے کہ درشن کر لئے۔
تو درشن کے لئے ایک دن بھی نہیں گئے؟
کہاں، لندن پلٹ ہیں، وہ ان باتوں کو کہاں مانتے ہیں۔ یہ تو ان کے باپ اتنے سیوک ہیں کہ مندر کی مورتی کی آنکھوں کے لئے ہیرے دے دئے۔

اچھا، اور ان کے بیٹے کیا کر رہے ہیں؟

شرابیں پی رہے ہیں پڑے پڑے، کنجریاں جو دھپور سے منگائی ہیں، یہاں تو کوئی ہے نہیں سوائے ایک پدمابائی کے جس نے گانا وانا چھوڑ ہی دیا۔
پدمابائی کا نام سن کر میں بھی چونکا۔ گانوں کا رسیا میں بھی تھا۔ یہ پدمابائی کون ہے میں نے پوچھا۔
صاحب، جے پور کی مشہور گانے والی تھی، اس کی آواز کے آگے کوئی ٹھہرتا نہیں تھا، مگر بس ایک دم جانے کیا ہوا کہ گانا وانا چھوڑ کر یہاں پاس کے گاؤں میں آن بسی، مندر کے علاوہ کہیں آتی جاتی نہیں اور کوئی بہت ہی شوق سے سننے آجائے تو بھجن سنا دیتی ہے۔
ہمیں سنا دیگی؟

ہاں صاحب کیوں نہیں، آپ کو بھی گانے کا شوق ہے مجھے پتہ ہے۔

تو پھر کب چلیں؟

صاحب یہ تو پدمابائی سے بات کرنی ہوگی، ہر ایک کو نہیں سناتی، میں ان کے ایک شاگرد کو جانتا ہوں، وہ اسکول میں پڑھاتا ہے، اس سے بات کروں گا۔

ہاں ضرور کرنا، اور سنو، کیا ان لوگوں سے بات ہو سکتی ہے۔

کن سے صاحب؟

یہ جو تم نے ذکر کیا ان رئیس لڑکوں سے؟

پتہ نہیں، ان سے بھی پوچھنا پڑے گا، جیالے ہیں، من موبجی ہیں، مان گئے تو مان گئے نہ مانے تو کسی کا زور نہیں چلتا بس باپو

سے ڈرتے ہیں اور کسی سے نہیں۔

ارے باپو سے بھی کیا ڈرتے ہوں گے بس یہی سوچتے ہوں گے کہ بڑھے نے جانداد سے بے دخل کر دیا تو مارے جائیں گے۔

آپ ٹھیک سمجھے ہو صاحب، وہ ہنسنا۔ بے حساب پیسہ ہے۔ یہ سمجھو کہ ٹانا اور برلا کے بعد اس کا نمبر ہے۔ ایک دنے خود بھی انگلستان گیا تھا۔ سنا ہے اڈنبرا کوئی جگہ ہے وہاں کوئی قلعہ نما محل دیکھ آیا، بس اس کا نقشہ وہیں کے ایک انجینئر کو دیا کہ عین مین ایسا گھر بنا دو، پیسے کی فکر نہ کرنا۔ گاؤں میں ایسا گھر بنا دیا کہ بڑے بڑے انگریز دیکھنے کو آتے ہیں۔

تو ہمیں نہیں دکھاؤ گے!

کیوں نہیں صاحب، یہ اچھا موقع ہے، لڑکے تو تینوں یہاں پڑے ہیں، آج ہی دورہ بنا لو، ہو آتے ہیں۔

بڑھا اجازت دے دیگا؟

وہ ہمارا کام ہے۔ بڑھا معمولی آدمی سے یہاں تک پہنچا ہے، اس میں ان لڑکوں والی بیٹری نہیں ہے۔ کوئی گھر دیکھنے آئے تو خوش ہوتا ہے۔ مگر آج تو شام ہو رہی ہے کل چلیں گے۔

ٹھیک ہے صاحب کل چلیں گے، آج کبیر صاحب سے بات کر لیتے ہیں وہ پدمابائی سے بات کر کے آپ کو لے جائیں گے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے میں نے کہا۔

کبیر صاحب اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ خاصے پڑھے لکھے تھے اور کتا ہیں پڑھنے کے شوقین تھے کئی رسالے اور اخبار باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ عمر اسی گاؤں میں گزارنی تھی اور یہیں گزارنے کا ارادہ تھا۔ وہ کسی زمانے میں پدمابائی کے شاگرد رہے تھے میرا شوق دیکھ کر مجھے ساتھ لے گئے۔ پدمابائی کا گھر بہت ہی معمولی جھونپڑا نما تھا، اور لگتا تھا کہ وہ دنیا سے دور، بہت تنہائی میں بسر کر رہی ہے۔ خدا معلوم کبیر نے کیا باتیں بنائیں کہ وہ مجھ سے ملنے پر راضی ہو گئی۔ اس نے میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی ہوگی کہ ایک بڑا افسران سے بھجن سننا چاہتا ہے۔ چھوٹے شہروں میں چھوٹے موٹے افسروں کا بھی بڑا مان ہوتا ہے۔ مجھے بھی گھر جا کر بچوں کی ریس ہیں اور بیوی کی غیر دلچسپ باتیں سننے سے زیادہ نئے لوگوں سے ملنا اچھا لگتا تھا۔

خیر، پدمابائی انکساری سے ملی۔ کسی زمانے میں خوبصورت رہی ہوگی، اب بھی چہرے کی جھریوں کے پیچھے ایک وقار اور آنکھوں کے دھندلکے میں ماضی کا چمکیلا غبار تھا۔

میں نے انکساری سے گانا سننے کی درخواست کی۔ وہ چپ رہی۔ مگر کچھ دیر بعد اپنا تانپورہ سنبھالا اور کچھ دیر الاپ کیا اور پھر اپنی پاٹ دار آواز میں میرا ایک بھجن یوں گایا کہ شام سے میں جیسے میرا کا انتظار مجسم ہو کر دروازے پر آکھڑا ہوا۔ میں تو وجد میں آگیا۔ میرے اوپر ہر اچھی آواز، ہر اچھے گیت، غزل، کپکے راگ۔ مناجاتوں اور مذہبی گیتوں کا ایک ساہی اثر ہوتا ہے۔ کتنے سال بعد ایسی من موہنی آواز ایسے درد اور ایسے کمال کے ساتھ سنی تھی۔

میں پدمابیوی کو کچھ دینا چاہتا تھا مگر وہ ہر گز راضی نہ ہوئی، بلکہ ہماری خاطر میں لگ گئی۔ دودھ کے گلاس کے ساتھ

رس گلے خدا جانے کہاں سے آگئے۔

بات کرنے کے لئے میں نے بات چھیڑی۔ سنا ہے آپ پارس ناتھ جی کے مندر تو جاتی ہیں۔

ہاں کبھی کبھی۔

آپ اس میلے میں نہیں گئیں؟

نہیں اب میلے ٹھیلوں میں نہیں جاتی۔ اس نے سادگی سے کہا۔

اس کے بعد اجازت لے کر ہم چلے آئے۔

واپسی میں کبیر نے کہا۔ سر آپ کو ایک بات بتاؤں؟

لوگ کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ انواہ ہو کہ پدمابائی نے یہ جوگ ان ہی سیٹھ جی کی خاطر لیا ہے جن سے ملنے کل ہم جا رہے ہیں۔
کیا تم بھی جا رہے ہو؟

ہاں سر، جب بچے چھوٹے تھے تو میں ان کو پڑھاتا تھا، میری تھوڑی بہت عزت ہے اس گھر میں۔

اچھا، کل ان سے پوچھ لیں گے۔

کیا سر؟

یہی کہ کیا پدمادیوی نے ان کے کارن جوگ لیا ہے۔

نہیں سر ایسی کوئی بات نہ کیجئے گا کہ الٹی پڑ جائے، وہ کیوں ماننے لگا کہ خود تو محل میں عیش کر رہا ہے اور اس کی خاطر کوئی عورت اپنا محل چھوڑ

جھوٹی میں رہ رہی ہے۔

ارے بھئی میں کیوں پوچھنے لگا، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تم نے وہ محل دیکھا ہے؟

بس بنتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب میرا ادھر جانا نہیں ہوتا۔ آپ کے ساتھ ہی دیکھ لوں گا۔

دوسرے دن ہم نے ادھر کا دورہ رکھ لیا۔ کبیر نے ایک دن پہلے ہی پیغام بھجوایا تھا کہ نئے اسٹیشن ماسٹر صاحب جو بہت پڑھے لکھے ہیں، ان کا

محل دیکھنے آنا چاہتے ہیں۔

اسٹیشن سے اس گھر تک کچی سڑک لمبا چکر کاٹ کر جاتی تھی۔ ہم نزدیک کی پگڈنڈی پر ہو لئے جو خاک دھول سے اٹی جھاڑیوں کے بیچ سے

گزرتی تھی۔ جب ہم اس قلعہ نما محل میں پہنچے تو سیٹھ کے مینیجر نے باہر بڑے دروازے کے آگے ہمارا استقبال کیا۔ دیواریں سلیٹی رنگ کے پتھر کی بہت

اونچی تھیں۔ دروازہ بے حد بڑا اور مضبوط ترین لکڑی کا تھا جس میں پھول نما چوڑی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹا دروازہ الگ تھا۔ دروازے کے باہر

ایک چوڑا مضبوط تخت پڑا تھا جس پر ایک منحنی سا شخص گر مڑیا مارے پڑا تھا۔

چھوٹے دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے تو سامنے انگریزی وضع کا ایک باغ تھا۔ اس ریگستان میں گلاب، ڈیلیا اور گل داؤدی دیکھ کر یوں لگا جیسے میں

خواب دیکھ رہا ہوں۔ گھر کے ایک طرف سوئمنگ پول میں فیروز پانی تھا، دوسری طرف ٹینس کالان تھا جس میں جال لگا ہوا تھا اور پیچھے کی طرف نیلے رنگ

کا ایک پردہ دیوار کی طرح کھنچا ہوا تھا۔ شام کو یہاں لڑکے ٹینس کھیلتے ہیں مینیجر نے بتایا۔

کس کے ساتھ کھیلتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

آپس میں کھیلتے ہیں، ڈبل کھیلنا ہو تو مجھے بلا لیتے ہیں ورنہ دوست احباب تو آتے ہی رہتے ہیں۔

شاید ہی کوئی مہینہ جاتا ہو جب یورپ سے یا بمبئی سے ان کے دوست نہ آتے ہوں۔

تو آپ یہاں مستقل رہتے ہیں۔ کبیر نے پوچھا۔

اور کیا، میرے بغیر اس محل کا انتظام نہیں چل سکتا۔ رسوائی گھر کا، صفائی کا، بجلی پانی کا ہزاروں انتظام ہیں، اتنے نوکروں سے کام کرانا بھی ایک

کام ہے۔

تنخواہ بھی خوب تنگڑی ملتی ہوگی۔ میں نے مذاق کیا۔

آپ کی ریلوے کا جنرل مینیجر بھی انگریز ہے، آپ کے خیال میں اس کو کتنی تنخواہ ملتی ہوگی؟

میرے خیال میں پانچ ہزار روپے ملتے ہوں گے۔

مجھے پندرہ ہزار روپے مہینہ ملتے ہیں۔ اس نے فخر سے کہا۔

اچھا، مجھے حیرت ہوئی۔ خیر اندر گئے۔ سارے کمروں کے فرش میں سنگ مرمر لگا ہوا تھا، ڈرائنگ روم میں چار پانچ الگ الگ حصے بیٹھنے کے قیمتی

سوفے، کرسیاں، انڈیا ٹیبل اور ڈنا بھر کے عمارت سے مزین تھے۔ خانہ کمرہ اور مسٹر لوار سے لے کر تھوڑے تھوڑے اور انکا

باریک مچھر داناں چھت تک پہنچی ہوئی تھیں۔ کمروں میں اور لائبریری میں نایاب پینٹنگز تھیں، اور گل دانوں میں تازہ پھول لگے ہوئے تھے۔
میں خود کو بار بار یقین دلارہا تھا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے اور میں یورپ میں نہیں راجھستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوں۔
آخر میں نے مینیجر سے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔ حضرت یہ تو بتائیے کہ یہ محل انھوں نے یہاں ایسے گناہ گاروں میں کیوں بنایا؟
بچوں نے تو بہت کہا کہ جو دھپور، جے پور یا اجیر میں بنا لیجئے۔ مینیجر نے کہا۔ مگر سیٹھ صاحب نے ضد پکڑ لی کہ بنے گا تو ان کے آبائی گاؤں میں
ورنہ نہیں، جو ان بچے بھی ہار گئے۔

کبیر نے مجھے معنی خیز انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔
گھر دیکھ کر نکلے تو تخت پر سویا ہو آدمی اٹھ بیٹھا تھا۔ مینیجر نے تعارف کروایا۔ ان سے ملنے یہ ہیں سیٹھ صاحب، اس محل کے مالک۔ میں نے
ان کے ہیرے کے بٹن دیکھنے کی کوشش کی مگر ان کے تن پر کرتہ ہی نہیں تھا۔ صرف ایک دھوتی باندھے تھے۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ کر بے رام جی کی کہا۔
میں نے بھی ہاتھ جوڑ دئے۔ اتنے میں ایک لمبی سی کار آن کرر کی تینوں لڑکے سوٹڈ بوٹڈ
اس میں سے اترے۔ دونوں چھوٹے لڑکے تو فوراً اندر چلے گئے بڑا ٹھہرا رہا۔ مینیجر نے اس سے بھی میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ میں ان کا محل دیکھنا چاہتا
تھا۔ لڑکے نے مجھ سے ملنے کے بعد باپ کو سلام کیا۔
پارس ناتھ جی کے درشن کر آئے۔ باپ نے پوچھا۔
ہاں۔ لڑکے نے بڑے وثوق سے کہا۔
پر شاد لائے؟

ہاں، گنگرام لارہا ہے۔
پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر بولا۔ آپ نے بابو جی کا شان دار بیڈروم بھی دیکھا ہو گا مگر یہ یہاں تخت پر پڑے رہتے ہیں کہتے ہیں بند ایر کنڈیشنڈ کمروں
میں میرا دل گھبراتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ بھی اندر سنک گیا۔
باپ بولے۔ ارے ان لڑکوں کو میری ہر بات پر اعتراض ہے۔ کہتے ہیں لوگوں کو گھر کیوں دکھاتے ہیں، یہ میوزیم نہیں ہے، میں کہتا ہوں
لوگ شوق سے دیکھنے آتے ہیں تو دکھاتا ہوں، جس دن تم ٹھکرانیاں لے آؤ گے اس دن سے نہیں دکھاؤں گا۔
میں ان کے ساتھ وہیں کھرے تخت پر بیٹھ گیا۔ کیا بات ہے آپ کے محل کی، میں نے کہا۔ آپ خرچ کرنا جانتے ہیں تبھی تو خدا نے آپ کو اتنا
دیا ہے۔ اب دیکھئے کہ پارس ناتھ کی مورتی کے لئے آپ نے دو اتنے قیمتی ہیرے دے دئے، بھلا اتنا کون کرتا ہے!
یہ آپ سے کس نے کہا؟ سیٹھ نے پوچھا۔
سب ہی کو معلوم ہے۔ میں نے کہا۔

نہیں نہیں، غلط کہتے ہیں لوگ، وہ میں نے نہیں دئے وہ تو ایک خدا ترس مائی نے دئے ہیں۔ لوگ اس بات کا یقین اس لئے نہیں کرتے کہ اب وہ
غریب ہو گئی ہے، ایک جھونپڑے میں رہتی ہے، مگر کبھی وہ بھی محل میں رہتی تھی۔
پدمابائی تو نہیں، میں نے عام سے لہجے میں کہا۔
ان کا رنگ کچھ اڑا۔

آپ جانتے ہیں اس کو؟
کل گیا تھا، ایک بھجن سنا، کیا گاتی ہے! کیا بھلی آواز ہے۔ کبھی آپ بھی جا کر سنئے۔ میں نے کہا۔

مجھے شوق نہیں۔ انھوں نے کہا۔

میں نے رخصت چاہی۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ دئے، میرے چلنے سے پہلے ہی وہ پھر گڑ مڑ یا مار کر تخت پر پڑ چکے تھے۔

کبیر نے کہا۔ سر ایک راز کی بات کہوں۔

ضرور کہو۔ میں نے کہا۔

یہ صرف اس لئے یہاں پڑے رہتے ہیں کہ ان کا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ یہ اس شان دار محل کے اندر رہیں جب کہ پدمابائی جھونپڑی میں

رہے۔

واہ کبیر صاب، اب تم نے یہ قصہ گڑھ لیا ان کے بارے میں، کیا افسانے وغیرہ لکھتے ہو؟

میں نے پوری تحقیق کی ہے سر۔ یہ پشکر برہمن ہیں یہ کسی ایسی ویسی عورت سے شادی نہیں کر سکتے تھے، پر جوانی میں اس پر دل آگیا تھا، ابھی

تک عشق کا سبق بھولے نہیں آپ نے تو سنا ہی ہو گا ع اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔ میں جن دنوں بچوں کو پڑھاتا تھا کئی مرتبہ سیٹھ صاحب کے

ساتھ پارس ناتھ جی کے مندر گیا ہوں اور یہ دیکھا ہے کہ سیٹھ صاحب آنکھوں کے ان ہیروں کو تکتے رہتے ہیں جو کبھی پدمابائی کے خوبصورت کانوں میں

جڑے تھے۔
